حقوقِ نسواں اور چند معاشرتی حقائق

ڈاکٹر انیس احمد

عصر حاضر میں اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے پائے جانے والے تاثرات میں مسلم معاشروں میں عورت کا مقام و کردار ایک مرکزی موضوع کا مقام اختیار کر گیا ہے اور بعض غلط العام تاثرات کی تکرار نے بہت سے مسلم اہل قلم کو مدافعانہ انداز میں اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے پر آمادہ کر دیا ہے۔ کسی بھی عصری مسئلے کا علمی جائزہ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ پہلے اس مسئلے کی نوعیت، اس کے اسباب اور اس سے نکلنے والے نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے معروضی طور پر یہ دیکھا جائے کہ جس بنیاد پر دلائل کی عمارت تعمیر کی گئی ہے، کیا وہ درست ہے یا اس کی ٹیڑھ پوری عمارت کے ایک جانب جھک جانے کا سبب ہے اور کیا واقعی مقصود ایک ٹیڑھی عمارت ہے یا سیدھی تعمیر۔

تقابلی مطالعوں میں عموماً ایک محقق کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس مواد کو یک جا کر دے جو تحقیقی مفروضے سے مطابقت رکھتا ہو اور منطقی طور پر وہ نتیجہ حاصل کر لے جو پہلے قیاس کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ اکثر مغربی تجزیوں کا آغاز مسلم دنیا میں پائی جانے والی چند بے ضابطگیوں سے ہوتا ہے جنھیں عموم کا مقام دے کر وہ نتیجہ حاصل کر لیا جاتا ہے جس کو مستحکم کرنے کے لیے مواد جمع کیا گیا تھا۔ مجھے اس امر کا پورا احساس ہے کہ کوئی انسان جو کسی معاشرے اور کسی علمی روایت سے وابستہ ہو مکمل طور پر اپنے آپ کو اپنے ثقافتی ماحول سے آزاد نہیں کر سکتا، لیکن اگر ایک محقق کو اپنی محدودیت اور اپنے تصورات کا پورا اِدراک ہو اور ساتھ ہی وہ دیگر نظریات کو عادلانہ نظر سے دیکھے جس کا حکم قرآن کریم نے شہادت کے حوالے سے دیا ہے کہ چاہے وہ شہادت ایک فرد کے خونی رشتہ دار ہی سے تعلق رکھتی ہو، شہادت حق ہی ہو اور اس میں رشتے کا تعصب نہ آنے پائے۔ چنانچہ علمی جائزے

میں بھی اس حقیقت کو جاننے کے باوجود کہ ایک مسلمان محقق اسلامی نظام حیات کی حقانیت پر ایمان رکھتا ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات اور دیگر تصورات کو معروضی طور پر ایک کھلے ذہن کے ساتھ اور پہلے سے تصور کردہ مفروضوں سے نکل کر جائزہ لینے کے بعد ایک قول فیصل تک پہنچے۔

اس بنیادی اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو عصر حاضر میں مغربی فکر اور مغرب زدہ مفکرین جن امور پر اپنی توجہ مرتکز کرتے ہیں انھیں اسلام میں خواتین کے حقوق خصوصی دل چسپی کا باعث نظر آتے ہیں۔ ہمارے خیال میں ایسا ہونا کوئی تعجب کی بات بھی نہیں کیونکہ خود مسلم اہل فکر نے اس موضوع پر یا تو فقہی نقطۂ نظر سے فقہی احکام کی تشریح کرتے ہوئے عورت اور مرد یا شوہر اور بیوی کے حقوق پر سیر حاصل بحث کی ہے، یا بعض اختلافی مسائل میں اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے قانون اور فقہی آرا کا دفاع کیا ہے۔ چنانچہ حدود اور قصاص و دیت کے معاملات میں ایک عورت کی شہادت کی حیثیت کیا ہوگی، وراثت میں تقسیم کا جو تناسب اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے اس پر کوئی 'نظر ثانی' ہوگی یا نہیں، ایک شادی شدہ شخص کو دوسری شادی کرنے کا اختیار ہے یا نہیں، اور ریاست اس سلسلے میں کیا قدغن لگا سکتی ہے ___ وہ موضوعات ہیں جو توجہ کا مرکز رہے ہیں۔

اسلامی قانون کے حوالے سے بحث کرتے وقت عموماً جو رویہ اختیار کیا جاتا ہے وہ بھی قابلِ غور ہے۔ اکثر مغربی جامعات سے فارغ التحصیل مسلم مفکرین، مغربی فلسفۂ قانون کے مطالعے اور اس کے بنیادی مفروضوں پر ایمان لانے کے بعد اسلامی فقہ اور قانون کے بارے میں اپنا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ چونکہ فکری بنیاد مغربی فلسفۂ قانون ہوتا ہے، اس لیے بار بار وہ سوالات اٹھائے جاتے ہیں جو نہ تو نئے ہیں اور نہ منطقی طور پر صحت رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ وہ قانون جو ساتویں صدی عیسوی میں یا نویں صدی عیسوی میں وجود میں آیا، آخر کس طرح اکیسویں صدی کے تغیّر شدہ ماحول و حالات میں قابل عمل ہوسکتا ہے، یا یہ کہ قرآن کے احکامات جو خواتین سے متعلّق ہوں یا مردوں سے یا معاشرے کے مسائل سے، آج کس طرح نافذ ہوسکتے ہیں، جب کہ ہم 'بدوی' معاشرے سے آگے نکل چکے ہیں!

خواتین کی قانونی شہادت، وراثت میں تناسب، تعلیم کا حصول، گھر میں فیصلہ کن معاملات میں مقام، سیاسی کردار، معاشی میدان میں عمل دخل، فوج اور پولیس میں یکساں نمایندگی، نکاح میں

مرد کی طرح ایک سے زائد شوہروں سے زواج قائم کرنا، نماز میں امامت اور جمعہ کا خطبہ دینا وغیرہ وہ مسائل ہیں جن پر اس انداز سے بات کی جاتی ہے گویا یہ مسائل اچانک دریافت کر لیے گئے ہیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور شارع اعظم کے علم میں ان کا کہیں آس پاس بھی سراغ نہیں پایا جاتا تھا۔ ان مسائل سے لاعلمی پر مبنی ایک شریعت ہمارے حوالے کر دی گئی، اور اب چونکہ یہ مسائل یکایک دریافت ہو گئے ہیں اس لیے وہ شریعت جو ان سے لاعلمی کی بنا پر بنی تھی خود بخود اپنی قانونی قوت کھو بیٹھی ہے!

علمی اور معروضی تحقیقی حکمت عملی کا بنیادی مطالبہ ہے کہ پہلے یہ بات طے کر لی جائے کہ شریعت ہے کیا؟ کیا یہ ایک مردانہ ذہن کے پیدا کردہ تصورات اور حدود و قیود پر مبنی ہے، یا اسے خالق کائنات اور صانعِ انسان نے انسان اور انسانی معاشرے کی ضروریات، مستقبل کے مطالبات اور ضروریات کے پیش نظر نازل کیا ہے؟ اگر شریعت زمان و مکان کی قید میں ہے تو لازماً اسے تغیّر و تبدیلی سے گزرنا ہو گا لیکن اگر شریعت زمان و مکان کی قید سے آزاد اُن آفاقی اصولوں پر مبنی ہے جن پر انسانی خمیر کی تعمیر کی گئی ہے، تو اس میں آفاقیت ہو گی اور تبدیلیِ زمان و مکان سے اس کی قانونی قوت میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔

مرد اور عورت سے متعلّق جو ہدایت نامہ قرآن کریم کی شکل میں اور اس کا عملی نمونہ حیاتِ مبارکہ سید الانبیا خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں ہمارے سامنے رکھا گیا ہے، ان دونوں میں عدمِ تغیّر، آفاقیت اور عالم گیریت کو اپنی مکمل شکل میں رکھ دیا گیا ہے۔ اس بنا پر قرآن کریم نے سنت کو تشریعی مقام دیا ہے۔ سنت، مدینہ اور مکہ کی زمانی و مکانی قید سے آزاد ہے۔ یہ اسوۂ حسنہ محض اخلاقی نصائح تک محدود نہیں ہے۔ یہ حدود کے اجرا، بین الاقوامی معاہدات، سفرا کے تقرر، قاضیوں اور مفتیوں کی نامزدگی، زکوٰۃ کے نصاب، مرتدین کے خلاف قتال، معاندین زکوٰۃ کی سرکوبی، غرض ان تمام معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی معاملات سے تعلّق رکھتا ہے جو منصبِ نبوت کے فرائض میں شامل تھے۔

بعض سادہ لوح افراد قرآن فہمی کے دعووں کے ساتھ جب یہ بات کہتے ہیں کہ قرآن میں تو 'رجم' کا ذکر نہیں پایا جاتا تو یہ بھول جاتے ہیں کہ قرآن کریم شارع اعظم کو حکماً یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ تحلیل و تحریم کریں۔ نتیجتاً ان کے تحکیم کردہ معاملات کو حتمی مقام حاصل ہو جاتا ہے: ''(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصّہ ہے) جو اس رسول نبی امّی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اختیار کریں

جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے بدی سے روکتا ہے۔ ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے'' (اعراف ۷:۱۵۷)۔ یہاں پر براہِ راست رسولؐ کو تحریم و تحلیل کا اختیار دیا گیا ہے۔

اس بنا پر کہا گیا ہے کہ آپؐ کا فیصلہ اللہ کے فیصلے کی طرح ہے اور جو اس فیصلے کو قرآن کے احکامات سے الگ سمجھتا ہے اس کا مقام و مرتبہ ایمان سے گرا ہوا ہے۔ ایمان کی شرائط میں سے یہ شرط قرآن کریم خود بیان کرتا ہے کہ جب تک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور فیصلے کو کشادہ دلی کے ساتھ، بلاکسی تردد کے نہ مانا جائے، اس وقت تک کوئی مومن نہیں ہوسکتا ہے: ''نہیں، (اے محمدؐ) تمھارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سر بہ سر تسلیم کرلیں'' (النساء ۴:۶۵)۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اللہ سبحانہ کی اطاعت قرار دیتے ہوئے فرقانِ حکیم فرماتا ہے: ''جس نے رسولؐ کی اطاعت کی، اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی اور جو منہ موڑ گیا، تو بہر حال ہم نے تمھیں ان لوگوں پر پاسبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے'' (النساء ۴:۸۰)۔ اس سلسلے میں حرفِ آخر وہ فرامین ہیں جو یہ کہتے ہیں: ''مومنو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ ہونے دو'' (محمد ۴۷:۳۳)۔ مزید یہ کہ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمھاری طرف آنے سے کتراتے ہیں''۔ (النساء ۴:۶۱)

اس ضمنی توضیح سے قطع نظر، جو بات بلاجھجک کہنے کی ضرورت ہے وہ بہت آسان ہے۔ وہ یہ کہ اسلام اپنے تصورِ عدل کی بنا پر مرد اور عورت دونوں کے حوالے سے جو ہدایات دیتا ہے ان کی بنیاد جنسی تفریق نہیں ہے، جب کہ مغربی اور مشرقی فکر چاہے وہ مذہبی مصادر میں ہو یا معاشرتی علوم میں اس کی بنیاد جنس (gender) کی تفریق (discrimination) پر ہے۔ چنانچہ اسلام نے جو حق خواتین کو ساتویں صدی عیسوی میں دیا کہ وہ ریاستی امور میں اپنی رائے خلیفہ کے انتخاب کے موقعے پر دیں (حضرت عثمانؓ کی خلافت کے انتخاب کے موقعے پر مدینہ کے ہر گھر کی خواتین سے ان کی

راے سرکاری طور پر لی گئی)، وہ حق یورپ میں ۱۸۹۲ء میں صرف اصولی طور پر تسلیم کیا گیا، جب کہ اس پر عمل بیسویں صدی میں ہوا۔

آج بھی مغرب اور مشرق میں خواتین کاغذی حد تک تو بعض حقوق رکھتی ہیں لیکن زمینی حقائق اس سے متضاد صورتِ حال پیش کرتے ہیں۔

اسلامی نظامِ حیات کا بنیادی نکتہ 'عدل' ہے۔ عدل اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ ایک فرد پر اس کی برداشت اور استعداد سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے، اس کی وسعت کے لحاظ سے اس کی جواب دہی ہو۔ یہ قرآنی اصول کسی تعارف کا محتاج نہیں کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ط (البقرہ ۲:۲۸۶)، ''اللہ کسی نفس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا''۔

چونکہ اسلام ایک مہذب معاشرے کے قیام کے لیے خاندان کو بنیادی ادارہ قرار دیتا ہے اور مذاہب عالم کے تمام تصوراتِ 'تقویٰ و پاک بازی' کے برخلاف رشتۂ ازدواج اور شوہر اور بیوی کے صحت مندانہ اخلاقی تعلّق کو تقویٰ اور ایمان کی علامت سمجھتا ہے، اس بنا پر عدل کا مطالبہ ہے کہ خواتین کی سیاسی، معاشی، معاشرتی سرگرمیوں کو خاندان کے تناظر میں دیکھتے ہوئے شریعت کے بنیادی مقاصد اور 'مصلحت' کو سامنے رکھتے ہوئے ایک عادلانہ رویہ اختیار کیا جائے۔ اسلام میں شادی کا مقصد ایک 'کماؤ بیوی' کا حصول نہیں ہے بلکہ آنے والی نسلوں کی معمار اور گھر کے اندر سکون، رحمت اور موّدت کا ماحول فراہم کرنے والی بیوی کا حصول ہے۔

اسلام کا تصورِ اجتماعیت اس کے عدلِ اجتماعی سے منطقی طور پر وابستہ و پیوستہ ہے اور یہ تصور مغربی اور مشرقی تصورِ انفرادیت کی مکمل ضد ہے۔ اس میں فرد کو جائز قانونی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی مقام کا تحفظ دیتے ہوئے معاشرتی رشتے میں جوڑا گیا ہے، جب کہ دیگر نظاموں میں، وہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے، فرد کو عبادات میں محض اپنے خدا سے رشتہ جوڑنے کا تصور اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ مشرقی اور مغربی تصورِ عبادت یہ مطالبہ کرتا ہے کہ مذہب اللہ اور بندے کے درمیان ایک نجی (private) اور ذاتی (personal) رشتہ ہے۔ اسلام اس کی تردید کرتے ہوئے حکم دیتا ہے کہ نماز جماعت کی شکل میں قائم کرو اور اجتماعی طور پر نہ صرف نماز بلکہ صیام، حج اور زکوٰۃ کو ادا کرو۔ قرآن کریم ان عبادات کے لیے ریاست کو ذمہ دار بناتا ہے کہ وہ ان کے قیام اور تحفظ کے لیے

اپنی قوت نافذہ کا استعمال کرے۔ یہ بنیادی نظریاتی فرق اگر سامنے نہ رکھا جائے تو پھر اہلِ علم بھی اس دوڑ میں لگ جاتے ہیں کہ مغرب یا مشرق عورت کو کون سے 'انفرادی حقوق' دیتا ہے اور مقابلتاً اسلام کون سے ایسے حقوق دیتا ہے۔

مسئلہ یہ نہیں ہے کہ انفرادی حقوق کی دوڑ میں کون کس سے آگے ہے، مسئلہ یہ ہے کہ عدل کس بات کا مطالبہ کرتا ہے۔ کیا یہ عدل ہوگا کہ ایک خاتون سے یہ کہا جائے کہ وہ اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کرے، ایمان کی تکمیل کے لیے شادی کرے اور اپنی خاندانی ذمہ داریوں کو جو وہ ایک سماجی معاہدے کے ذریعے اختیار کرتی ہے، پوری ذمہ داری سے ادا کرنے کے ساتھ ساتھ صبح سے شام تک کم از کم ۸ گھنٹے ایک معاشی کارکن کے طور پر کام کرے، اور جب گھر واپس آئے تو پھر اپنے خاندانی وظائف میں مصروف ہو جائے اور اس بات پر فخر کرے کہ وہ 'مرد کے شانہ بہ شانہ'، 'معاشی دوڑ' میں اپنا کردار ادا کر رہی ہے! چاہے اسے اس دوڑ کے لیے اپنے اعصابی تناؤ کو قابو میں رکھنے کے لیے صبح شام ادویات کا استعمال کرنا پڑے، ہر روز کام پر جانے کے لیے دو گھنٹے سخت ہجوم میں ٹیکسی، بس یا اپنی ذاتی گاڑی میں سفر کرنا پڑے اور دفتر میں جنسی استحصال کا نشانہ بننا پڑے، لیکن وہ یہ سب کچھ اس لیے کرے کہ مغربی اور مشرقی تہذیب ایک کارکن خاتون کو زیادہ پیداآور (productive) کہتی ہے! اگر معروضی طور پر صرف اس آمدنی اور اس خرچ کا ایک میزانیہ تیار کر لیا جائے جو ایک 'کارکن عورت' اپنی 'دفتری ضرورت' کے طور پر ذاتی تزئین پر خرچ کرتی ہے تو 'معاشی ترقی' کے غبارے سے ہوا نکل جائے گی۔ اندازہ ہو جائے گا کہ جو آمدنی گھر لائی جارہی ہے اور جس کا تذکرہ بطور 'دو تنخواہوں' کے ہر صحافیانہ تحریر میں پایا جاتا ہے وہ اصلاً کتنی آمدنی ہے۔

مسئلہ آسان ہے۔ مغرب و مشرق کا ذہنی سانچہ جنسی تقسیم اور استحصال پر مبنی ہے۔ مغرب کی پوری تہذیب میں، جواب مشرق میں بھی عام ہے، عورت ایک 'شے' (commodity) سے زیادہ مقام نہیں رکھتی اور وہ بھی ایسی شے جس کا استحصال کر کے ایک مردانہ معاشرہ اپنے مقاصد حاصل کرے۔ اس کے برخلاف اسلامی شریعت کی بنیاد عدل کے اصول پر ہے جو یہ مطالبہ کرتا ہے کہ کسی فرد پر اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے، اور اسے اس کی ذاتی حیثیت میں اور اجتماعی حیثیت میں یکساں حقوق حاصل ہوں۔

مسلم اہل علم کی ذمہ داری ہے کہ اسلامی شریعت کے آفاقی پہلو کو اور اس کے نتیجے میں ایک ایسے انسانی معاشرے کے وجود میں آنے کو، جو عدل اجتماعی پر مبنی ہو، مرکزِ گفتگو بناتے ہوئے یہ جائزہ لیں کہ اطلاقی سطح پر یہ اصول کہاں تک مسلم معاشروں میں پایا جاتا ہے۔ بلاشبہہ مغربی معاشرے میں عورت کا استحصال، اس کی عصمت وعفت پر حملے، اس کے حقوق کی پامالی کی داستان ایک اذیت ناک کہانی ہے لیکن مسئلے کا حل محض یہ کہہ کر نہیں ہوسکتا کہ مغرب خواتین کے ساتھ ظلم کر رہا ہے۔ ہمیں خود اپنے معاشروں میں ہونے والے مظالم کو ختم کرنا ہوگا جن کی بنیاد وہ جاگیردارانہ ذہن ہے، جس کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ کوئی فرد جاگیردار ہی ہو۔ یہ ایک ذہنیت ہے جو ایک مزدور میں بھی اتنی ہی شدت سے پائی جاسکتی ہے جتنی ایک لاکھوں ایکڑ کے مالک وڈیرے یا سردار میں پائی جاتی ہے۔

ہمارے معاشرے میں دین سے ناواقفیت اور دین کے نام پر دو انتہاؤں کا پایا جانا بھی ایک بڑا مسئلہ ہے کہ ایک جانب یہ ایسی شدت پیدا کرتی ہے کہ ایک خاتون اپنے گھر میں اجنبی اور ایک کمرے میں مقید ہو کر رہ جائے اور وہ صرف شوہر اور حقیقی اولاد کے ساتھ تو بات چیت کر سکے، بلاتکلف کھانے میں شریک ہوسکے لیکن ان کے علاوہ اقربا اور رشتہ داروں سے مکمل قطع رحمی پر مجبور کر دی جائے۔ دوسری طرف وہ انتہا بھی ہے کہ حجاب کو محض نگاہ تک محدود کر دیا جائے اور جسم کی عریانی کو معاشرتی ضرورت قرار دے دیا جائے۔ ہمیں ان دونوں انتہاؤں سے نکلنا ہوگا اور مدینہ منورہ کے معاشرے میں صحابیاتؓ کے طرزِ عمل کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی اور اجتماعی اخلاقیات کے اصولوں کی روشنی میں ایک نیا معاشرہ تعمیر کرنا ہوگا۔ وہ معاشرہ جو قرآن وسنت کے بنیادی اصولوں، شرم وحیا، عفت وعصمت، پاک بازی اور تقویٰ کو عملی زندگی میں ڈھال کر پیش کر سکے۔

اس سلسلے میں تعلیمی حکمتِ عملی، معاشرتی رسوم و رواج کی تبدیلی، اور سب سے بڑھ کر افراط وتفریط والے ذہن کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پوری دیانت اور نفس کے تجزیے واحتساب کے ساتھ اپنے معاملات کو شریعت کے دائرے میں لانا ہوگا۔

شریعت کا دائرہ نہ قید و بند پر مبنی ہے نہ مادر پدر آزادی پر۔ یہ وہ حدود ہیں جو معروف پر مبنی ہیں۔ یہ معروف وہ ہے جو خالق کائنات نے خود متعین کیا ہے۔ یہ معاشرتی تبدیلی وارتقا کے ساتھ

تبدیل نہیں ہوتا۔ یہ قرآن و سنت کی طرح سے آفاقیت اور عالم گیریت کا حامل ہے۔ اگر گفتگو معروف ہو، اگر معاشرت معروف ہو، اگر مہر معروف ہو، اگر رخصتی بھی معروف ہو، اگر معیشت معروف ہو تو پھر عدل کا قائم ہونا ایک منطقی عمل ہے۔

اس قیامِ عدل کے لیے راستہ صرف ایک ہے: قرآن و سنت سے براہِ راست تعلّق، اس کی تعلیمات و احکامات کا کسی حیل و حجت کے بغیر اور مغرب و مشرق کی فکری غلامی سے آزادی کے ساتھ اس کا نفاذ۔

اسلامی شریعت کی بنیاد نہ جنس کی تفریق ہے نہ رنگ و نسل اور زبان کی تفریق۔ یہ آفاقی اور عالمی حیثیت کے اصولوں پر مبنی وہ شریعت ہے جو قیامت تک کے لیے اصولِ حکمرانی فراہم کرتی ہے اور وعدہ کرتی ہے کہ کسی متنفس کے ساتھ ذرہ برابر بھی ظلم روا نہیں رکھا جائے گا۔ یہ تمام انسانوں کے لیے یکساں حقوق کی علَم بردار اور ان کے عملی نفاذ کی مثال پیش کرتی ہے۔ یہ انسان کو وقار، عزت، اکرام اور معاشرتی وجود سے نوازتی ہے۔ یہ محض مسلم معاشرے میں نہیں بلکہ دنیا میں جہاں کہیں بھی اس پر عمل کیا جائے گا ایک صحت مند معاشرے کو وجود میں لائے گی۔ یہی سبب ہے کہ یورپ و امریکا کے وہ بے شمار متلاشیانِ حق جو اپنے معاشروں کے ظلم و استحصال سے بے زار ہیں یہ جاننے کے باوجود کہ یہ زریں اصولِ شریعت بہت سے مسلم ممالک میں بھی ابھی تک اجنبی ہیں اور مسلم ممالک کے غلام ذہن رکھنے والے فرماں روا ان اصولوں کے مفید اور قابل عمل ہونے کا شعور نہیں رکھتے۔ یہ متلاشیِ حق بادِمخالف کے باوجود اسلام کے سچّا اور برحق دین ہونے اور اس دور میں قابلِ عمل ہونے کو دل سے تسلیم کرتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ کامیابی اسلام کی کامیابی ہے۔ اس میں مسلمانوں کی اپنی معاشرتی مثال کا کوئی دخل نہیں۔ اگر مسلمانوں کے معاشرے میں بھی اسلام کو وہ مقام حاصل ہو جائے جو ان متلاشیانِ حق کے دلوں میں اسلام کو حاصل ہے، تو پھر پوری انسانیت کو اس عدل کو دیکھنے کا موقع مل سکتا ہے جو قیامت تک کے لیے صرف اور صرف حق و صداقت ہے اور انسانیت کو معراج پر لے جانے کا واحد راستہ ہے۔